رواداری کا تصور اور حدود (اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں)

ڈاکٹر اختر حسین عزمی☆

Abstract:

"The Holy Qur'an declares Islam as the best religion. So being the best religion it stands as a matter of principle that there is no undue compulsion in religious matters and one is free to accept or negate any faith. God has declared His Prophet (PBUH) to remind others of their deeds without enforcing his own will. At the same time the Qur'an has forbidden the Muslims to abuse the deities of others.

The Holy Prophet (PBUH) allowed all the Jews and the tribes of Madina to worship according to their own believes. The accord which the Holy Prophet (PBUH) under took with the Christians of Nijran, the protection of their churches and their religious freedom was assured. They were permitted to live their religious life according to their will.

However, tolerance does not mean that false ideas and practices should not be criticized. In Islam tolerance is permitted to accommodate the feelings of others but there is no room to compromise with false ideas. The above mentioned aspect is for non-Muslims while the other belongs to the Muslim schools of thought."

رواداری سے مراد کسی انسانی اجتماعیت کا ان باتوں کو جنہیں وہ نظریاتی طور پر اپنے دائرے میں غلط اور ناپسندیدہ سمجھتی ہے، دوسرے انسانوں کو جو انہیں پسند کرتے ہیں، ان کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے

☆اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

انہیں اختیار کرنے کا حق دینا اور ناپسندیدگی کے باوجود برداشت کرنا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جب تک انسانوں کو ارادہ وعمل کی آزادی حاصل ہے، وہ ایک ہی نظام فکر کے پابند نہیں ہو سکتے اور جزوی تفصیلات میں تو ان کے درمیان اختلاف کا ہونا ان کے مزاج اور ذوق کے تنوع کے باعث ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کا فرض منصبی دعوت وتذکیر ہی قرار دیا ہے: **فذکّر انما انت مذکّر**(۱) اور ساتھ ہی آپ کو بتایا کہ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں: **لست علیھم بمصیطر**(۲) لہٰذا اس فرمان کی روشنی میں حضور ﷺ نے دعوت وتذکیر اور یاددہانی میں انتہائی نرمی اختیار کی۔ ایک طرف اہل کفر کو ''**لکم دینکم ولی دین**''(۳) کہہ کر ان کے مشرکانہ عقائد سے برأت و بیزاری کا اعلان کیا تو دوسری طرف آپ کو ''**لا اکراہ فی الدین**''(۴) فرما کر انسانیت کے اس حق کو بھی باور کرایا گیا کہ اللہ تعالیٰ قبولِ ہدایت کے لیے کسی قسم کے جبر کو پسند نہیں کرتا۔

حق وباطل کے معرکہ میں نظریات سے جنگ بہر حال انسانی اذہان کی زمین میں لڑی جائے گی۔ اس لیے باطل کو ختم کرنا اور انسان کو آخری حد تک باطل سے نتھی رہنے سے بچانے کی کوشش کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ جیسا کہ فرمایا: **ادع الی سبیل ربك بالحکمه والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن**(۵) یہ اسی لیے فرمایا کہ جذبات انسانی کو کم سے کم ٹھیس پہنچا کر ان کے دل جیت لیے جائیں۔ حق اور باطل کا مقابلہ بھی ناگزیر ہے لیکن یہ مقابلہ انسان کو تکریم دینے کے لیے ہے نہ کہ اس کی تذلیل کے لیے۔ انسانوں پر حق کو بالجبر مسلط کرنے میں نہ انسان کی تکریم ہے نہ حق کی۔ بلکہ ان دونوں کی تکریم اس میں ہے کہ انسان آزادانہ مرضی سے حق کو قبول کرے: **فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر**(۶)

حضور ﷺ نے شرک کے ایک ایک مظہر پر ضرب لگائی۔ اہلِ شرک کی کٹ حجتیوں کا مدلّل جواب دیا، اہل کفر کی ایک ایک خامی کو نمایاں کیا لیکن سوائے ایک مقام کے اہلِ کفر کو بھی یا ایھا الکافرون کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ بتوں کی کمزوریوں کو نمایاں کیا گیا لیکن آپ نے بتوں کی تضحیک واستہزا کو اپنا شعار نہ بنایا۔ کیونکہ اللہ کا حکم تھا: **ولاتسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبو اللّٰه عدوا بغیر علم**(۷) ''اور جن کو یہ کافر اللہ کے مقابلے میں پکارتے ہیں تم انہیں گالیاں مت دو ورنہ وہ بھی اللہ کو بغیر علم کے دشنام دیں گے۔'' تمام انبیاء اپنی قوموں کے شرک اور غلط کاریوں پر جب تنقید کرتے ہیں تو بار بار وہ مخاطبین کو یا قومِ (اے میری قوم) کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ قرآن نے منافقین کے رذائل کو کھول کھول کر سورہ بقرہ، سورہ منافقون، سورۂ احزاب اور دیگر سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ایک مقام پر بھی **یاایھاالمنافقون** کے الفاظ سے خطاب نہیں کیا گیا۔ انہیں اہلِ ایمان کے صیغہ خطاب میں ہی مخاطب کیا گیا: **یاایھاالذین امنوا** اٰمنوا۔ بلکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی وفات پر اس کے کفن کے لیے اپنا قمیض بھی پیش کر دیا(۸) ایک یہودی کا جنازہ گزرتے ہوئے آپ نے دیکھا تو آپ

مجلس میں اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ (۹)

قریش کے ایک سردار عتبہ بن ربیعہ نے آپؐ سے سمجھوتہ گانٹھنے کے لیے دولت عورت اور حکومت کی جو پیش کش کی وہ آپؐ کی بلندی کردار اور مقاصد جلیلہ کے مقابلے میں انتہائی گھٹیا تھی لیکن آپؐ نے اپنے مقام و مرتبہ سے فروتر ان باتوں کو نہ صرف صبر و تحمل سے سنا بلکہ اپنی بات شروع کرنے سے قبل آپؐ نے اس سے استفسار کیا کہ اے ابوالولید! کیا تم نے اپنی بات مکمل کر لی۔ گویا اس کی بات کو مکمل سننا ضروری سمجھا گیا۔ مزید یہ کہ عتبہ کو اس کی کنیت ابوالولید سے پکار کر آپؐ نے گویا امت کو بھی یہ سبق دیا کہ کافر خواہ کتنی ہی گھٹیا بات کرے، اس کے لیے ادب و احترام کے الفاظ کا استعمال ترک نہیں کیا جائے گا۔

میثاق مدینہ کی شرائط میں یہود و مشرکین کے لیے ان کی مذہبی آزادیوں کے تحفظ کی بات کا شامل کرنا، حقوق انسانی اور بین الاقوامی معاہدات کی تاریخ میں واضح طور پر پہلی مرتبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس معاہدے کی ایک شق کے یہ الفاظ ہیں: لِلْيَهُودِ دِينُهُمْ وَلِلْمُسْلِمِينَ دِينُهُمْ (۱۰) مذہبی اختلاف جسے قریش نے ذاتی عناد میں تبدیل کر لیا تھا، جنگ بدر میں ان کے قیدیوں سے حسن سلوک کا مظاہرہ اور ان مخالفین اسلام سے مسلمان بچوں کی تعلیم کی خدمت لینا، رواداری کی عظیم مثال ہے۔ جس جہاد کو رواداری کا دشمن تصور کیا جاتا ہے، اللہ کے نزدیک وہی جہاد درحقیقت دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے تحفظ کا ذریعہ ہے: **ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوٰت ومسٰجد** (۱۱)

نجرانی عیسائیوں کے ساتھ حضور ﷺ نے جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک شق یہ تھی: **ان لا تهدم لهم بيعة، ولا يخرج لهم قسّ، ولا يفتنوا عن دينهم، مالم يحدثوا حدثًا او يأكلوا الربٰو** (۱۲) (ان کے کسی معبد کو منہدم نہیں کیا جائے گا نہ کسی پادری کو نکالا جائے گا۔ تبدیلی مذہب کے لیے انہیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ کوئی نئی بات نہ نکالیں یا سود نہ کھائیں، معاہدہ برقرار رہے گا۔)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اہل حیرہ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی ایک شق امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بیان کی ہے: وَلَا يَمْنَعُوا من ضرب النواقيس، ولا من اخراج الصلبان فی يوم عيدهم (۱۳) (ان کو کلیسا کی گھنٹیاں بجانے یا اپنی عید کے دن صلیب نکالنے سے منع نہیں کیا جائے گا)

عہد فاروقی میں عیسائیوں کو ناقوس بجانے کی کتنی فراخ دلانہ آزادی دی گئی، اس کا کچھ اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے: **ان يضربوا نواقيسهم فی أی ساعة شاء وا من ليل ونهار الا فی اوقات الصلوات** (۱۴) (کہ وہ نمازوں کے اوقات کے ماسوا دن اور رات کے جس پہر میں بھی چاہیں، اپنی گھنٹیاں بجا سکیں گے۔)

امن عالم کا قیام اور روئے زمین پر آباد افراد و اقوام کو اس قابل بنانا کہ وہ آزادانہ تبادلہ خیال کی فضا میں سانس لے سکیں۔ جس میں ہر فرد کو اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہو اور باہمی افہام و تفہیم کا موقع ملے، وقت کی ایک ضرورت ہے تاکہ باہمی میل جول (Interaction) کے نتیجے میں اسلام کی

حقانیت اور حکمت اہلِ کفر پر واضح ہو سکے۔ باہمی میل جول کا فائدہ ہمیشہ اس نظریاتی تحریک کو ہوتا ہے جس کا نظریہ اپنے اندر ذہنوں کو مسخر کرنے اور دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت (Potential) رکھتا ہو۔

غیر مسلم اہلِ علم کا اعتراف

نجران کے عیسائیوں کا وفد (۹ھ) مدینہ حاضر ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی میں انہیں اپنی رسوم عبادات ادا کرنے کی اجازت دی[۱۵] اور ایک ایسا منصفانہ اور ہمدردانہ معاہدہ کیا کہ ولیم میور جیسا متعصب مستشرق بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ لکھتا ہے:

''محمد ﷺ نے بشپوں، پادریوں اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجا گھروں اور خانقاہوں کی ہر چیز ویسے ہی برقرار رہے گی۔ کوئی بشپ اپنے عہدہ، کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور کوئی پادری اپنے منصب سے معزول نہیں کیا جائے گا اور ان کے اختیارات، حقوق میں کسی قسم کا تغیر نہ کیا جائے گا۔ اور جبر و تعدی سے کام نہیں لیا جائے گا۔''[۱۶]

فاضل ہندو محقق شری سندر لال جی اپنے مضمون ''آنحضرت کی زندگی'' میں لکھتا ہے:

''حکمران کی حیثیت سے محمد صاحب نے غیر مسلموں کو یہاں تک کہ بت پرستوں کو بھی اپنی ریاست کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی پوری پوری آزادی بخشی اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیا۔ لا اکراہ فی الدین مدنی آیت ہے اور محمد صاحب کی پوری زندگی اس آیت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔''[۱۷]

برطانوی مصنفہ Arm Strong سیرت طیبہ پر اپنی کتاب میں یوں اعترافِ حقیقت کرتی ہے:

"Muhammad..... founded a religion and tradition that was not based cultural on the sword, despite the western myth, and whose name Islam, signifies peace and reconciliation."[18]

برٹرینڈ رسل لکھتا ہے:

''عیسائیت اور ان کے علمبرداروں نے ہمیشہ اسلام اور حضرت محمدؐ کے خلاف باطل پراپیگنڈہ جاری رکھا ہے جب کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ محمدؐ ایک عظیم انسان اور فقید المثال مذہبی رہنما تھے۔ وہ ایک ایسے دین کے بانی تھے جو بردباری، مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔''[۱۹]

رواداری ___ ایک حقیقت پسندانہ عمل

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حضور ﷺ نہ تو مردم بیزار اور گوشہ نشین ہستی تھے اور نہ ہی

شدت پسندی آپ کے مزاج کا حصہ تھی۔آپ کی گوشہ نشینی کی زیادہ سے زیادہ مدت وہی ہے جو نزول وحی سے قبل آپ نے غارِ حرا میں اختیار کی۔نزول وحی کے بعد آپ کبھی غارِ حرا میں زاویہ نشین نہ ہوئے۔اس کے بعد آپ انسانوں کے اندر ان کی اصلاح کی کوشش فرماتے رہے۔قبل از بعثت آپ ایک بھرپور کاروباری زندگی گزار رہے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ مکہ کی مالدار اور کاروباری خاتون حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ سے متاثر ہوئیں۔بعثت سے قبل آپ ﷺ ایک سرگرم سماجی زندگی کے بھی متحرک پارٹنر تھے جس کا ثبوت معاہدہ حلف الفضول میں آپ ﷺ کی شرکت اور حجر اسود کی تنصیب میں آپ کی فہم وفراست اور اہلِ مکہ کا آپ ﷺ پر اعتماد ہے۔ایک ایسا شخص جس کی جوانی کی زندگی ایک بھرپور عملی زندگی کا تاثر اپنے اندر رکھتی ہے، جب وہ الہامی ہدایت کی روشنی میں لوگوں کو اصلاح وہدایت کا راستہ دکھاتا ہے تو یہ بات قابل فہم ہے کہ اس کی شخصیت کے سابقہ عمل اور تجربات اس کی دعوتی زندگی میں نظر آئیں۔یہی وجہ ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ میں ہمیں اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ آپ جہاں ایک طرف ٹھیٹھ عقیدہ ونظریہ کی بنیاد پر ایک اجتماعیت کی بنیادیں اٹھا رہے تھے وہاں آپ ﷺ معاشرے کے اندر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ایک پریکٹیکل انسان تھے۔

ایک پریکٹیکل انسان میں جہاں اپنے نظریات وعقائد اور زندگی کے تصورات پر کاربند ہونے اور اس کے ابلاغ کی تڑپ ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے جذبات کا لحاظ کرنا بھی اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔اسوۂ رسولؐ میں ہمیں اپنے عقائد وافکار پر غیر متزلزل یقین اور دوسروں کے جذبات کا لحاظ رکھنے کا جو حسین امتزاج ملتا ہے اس سے ہمیں رواداری کے حقیقی مفہوم سے آشنائی حاصل ہوگی اور عصرِ حاضر میں اس کے فروغ کی راہیں بھی ہمیں نظر آئیں گی۔اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں رواداری کے تصور کی وسعت اور گہرائی کا بھی اندازہ ہوگا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ یورپ آج جس رواداری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے، وہ محض خیالات کی لیپاپوتی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی سے ہمیں مغرب کی طرف سے رواداری کے فروغ کے نام پر برپا تحریک کے مکروہ عزائم بھی نظر آئیں گے اور یہ بھی کہ مغرب اور ہمارے تصور رواداری میں کیا فرق ہے اور اگر اس فرق کو ہم نے نظر انداز کر دیا تو پھر ہم خود اپنی روایات واقدار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

مغرب جو لبرل ازم اور رواداری کے نام پر ہم سے ہماری اقدار چھیننا چاہتا ہے، خود کس قدر متشدد ہے اس کا اندازہ یورپ میں مسلمان خاتون کے سر پر سکارف اور مساجد کے میناروں پر عائد ہونے والی پابندی سے لگایا جا سکتا ہے۔محض سکارف کی پابندی کرنے والی خاتون کو اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران عین کمرہ عدالت میں پولیس کی موجودگی میں قتل کرنا بقول اقبال مغرب کے ''اندروں چنگیز سے تاریک تر'' کا منظر دکھاتا ہے۔اس لیے ہمیں مغرب سے متاثر ہوئے بغیر رواداری کی ان بنیادوں کو تلاش کرنا ہوگا جو امن عالم کے قیام میں تمام انسانیت کے کام آسکیں اور تمام اقوام کو اُن کی تہذیب

وثقافت کے تحفظ کا احساس دلاسکیں نہ کہ رواداری کے نام پر ان کی اقدار پر ڈاکے مارنے اور رواداری کے فروغ کے بجائے کمزور اقوام کی خودداری چھیننے کا سنہری جال ہوں۔

رواداری کی حدود

کیا رواداری کا فروغ دو مخالف اور متصادم نظریات کی محض لیپا پوتی سے ممکن ہے؟ اس کا جواب اگر نفی میں ہے تو پھر مخالف نظریات کی موجودگی میں دیگر اقوام کا مل جل کر رہنے کا کیا طریقہ کار ہو؟ یہ وہ سوال ہے جس کا ہمیں اسوۂ رسول کی روشنی میں جواب تلاش کرنا ہے۔ اہل مغرب کے ہاں غلط اور صحیح کی بنیادیں اور ہیں اور اہلِ اسلام کے ہاں اور۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ایک کے ہاں درست ہیں اور دوسرے کے ہاں غلط۔ اگر کچھ باتوں میں اشتراک پایا بھی جاتا ہے تو بہت سی باتوں میں ٹکراؤ بھی ہے۔ ٹکراؤ کی صورت میں دونوں سے سازگاری ممکن نہیں۔

بظاہر تو رواداری کی صدا اس طبقے کی طرف سے بلند ہونی چاہیے جو کمزور اور اقلیتی ہو لیکن امر واقعی یہ ہے کہ اس کا پرزور مطالبہ بالعموم Status Que کی حامی قوتوں کی طرف سے ہوتا ہے جیسا کہ اہل مکہ نے حضورؐ کے پیغام کی قوتِ تاثیر سے ڈر کر آپ کو سمجھوتے کی میز پر لانے کی کوشش یہ کہہ کر کی: ائت بقرآن غیر ھذا او بدّلہ۔ (اس کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آؤ یا اسے تبدیل کر دو) تو اللہ نے حضورؐ سے کہلوایا کہ: **قل مایکون لی ان ابدّلہ من تلقاء نفسی ان اتّبع الّامایُوْحٰی اِلَیَّ** (کہو کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر لوں، میں تو اس وحی کا پابند ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے) غیروں کی خوشنودی کے لیے اگر مسلمان اپنے دین کے اصولوں میں کتر بیونت کرتے ہیں تو اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر ظلم کوئی نہیں۔ وہ اللہ کے ہاں مجرم قرار پائیں گے جنہیں دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل نہ ہوگی: **فمن اظلم ممن فتری علی اللہ کذبا او کذب بایاتہ انہ لایفلح المجرمون**[۲۰] حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کے معاملے میں کسی لاگ لپیٹ اور مفاہمت خواہانہ رویّے (Compromising attitude) سے اللہ نے اپنے رسولؐ اور ان کے صحابہ کو منع فرمایا: **ودّوا لوتدھن فیدھنون**[۲۱] (یہ کافر تو چاہتے ہیں کہ تم کچھ مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں)۔

مداہنت جس کا ذکر یہاں اللہ نے ناپسندیدگی کے ساتھ کیا ہے، کیا ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت معتبر مفسرین کی آراء کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ امام ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: **لوترخص لھم فیرخصون اوتلین فی دینك فیلینون فی دینھم**[۲۲] (کچھ تم ان کے لیے ڈھیل نکالو تو پھر یہ تمہارے لیے ڈھیل پیدا کریں یا یہ کہ تم اپنے دین میں نرمی لے آؤ تو یہ بھی اپنے دین میں نرمی لے آئیں)۔

امام قرطبی کے مطابق: **فان الادھان باللین والمصانعہ، وقیل بمجاملہ العدو ممایلتہ،**

وقیل: مقاربه فی الکلام والتلیین فی القول[۲۳] (ادھان کا مطلب ہے ڈھیل پیدا کر لینا اور سازگاری چاہنا۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ہے مخالف کے ساتھ لحاظ ملاحظہ کا رویہ اختیار کر لینا اور میلان باہمی چاہنا۔ دوسرے قول کے مطابق اس سے مراد کلام میں ایک دوسرے سے قربت پیدا کرنا اور بات میں ملائمت لے آنا)۔

امام ابن کثیر لکھتے ہیں: حضرت عبداللہؓ بن عباس سے مروی ہے کہ اللہ کے اس فرمان سے مراد ہے کہ تم ان کے لیے معاملہ کچھ ڈھیلا کرو تو پھر یہ بھی تمہارے لیے ڈھیل پیدا کر لیں گے۔[۲۴]

قرآن کے نزدیک کسی بھی عقیدہ یا نظریہ کو قبول کرنے یا رد کرنے، صحیح کہنے یا غلط کہنے کا اختیار تو انسانوں کو حاصل ہے لیکن یہ اختیار نہ اس عقیدہ کے مخالفین کو حاصل ہے اور نہ اس کے ماننے والوں کو کہ وہ اس عقیدہ کی تشریح و تعبیر اس کے اصل مراجع (standard references) سے ہٹ کر کریں۔ جذبات انسانی کا احترام بجا مگر حق کا احترام اس سے بڑی چیز ہے اور حق کے احترام کی بات کرنا، باطل کے خلاف دعوت و تبلیغ کرنا، رواداری کے خلاف نہیں۔ البتہ یہ رواداری کے خلاف ہے کہ تلوار کے زور پر لوگوں سے کلمہ پڑھوایا جائے۔

اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ حسن سلوک اور نرمی اور رواداری انسانوں کے ساتھ کرنے کا ہمیں حکم ہے: وقولوا للناس حسنا[۲۵] چاہے وہ باطل پر ہی کیوں نہ ہوں لیکن خود باطل نظریات کسی رواداری کا استحقاق نہیں رکھتے کیونکہ ان سے رواداری حق کی بھینٹ دیے بغیر ممکن نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقابلہ تو حق و باطل پر مبنی نظریات و رجحانات کے درمیان ہوگا لیکن اس جنگ کو بہر حال انسانی قلوب و اذہان میں برپا ہونا ہے۔ کوشش یہ کرنا ہے کہ حق و باطل کی اس مڈبھیڑ میں اس سرزمین کا نقصان کم سے کم ہو، انسانی جذبات کا مجروح ہونا کم سے کم ہو۔ جیسے ایک ڈاکٹر کی اصل جنگ مرض کے خلاف ہوتی ہے لیکن یہ جنگ اسے مریض کے جسم کے حساس اعضاء کے درمیان لڑنا ہوتی ہے۔ وہ کم سے کم نقصان کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ البتہ محض کسی اذیت کے خوف سے علاج ترک نہیں کر دیتا۔ گویا کہ کوئی معاملہ بھی جس میں اللہ اور رسولؐ نے کسی بات کا فیصلہ کر دیا ہو، اس میں لوگوں کے کسی گروہ کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا اسلام کے نزدیک رواداری نہیں۔ البتہ ایسی بات یا موضوع جسے دین نے مباح رکھا ہو یا جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہو، اس میں لوگوں کے رجحان طبع اور آسانی اور پسند کا لحاظ کرنا اور شدت و غلو اور انتہا پسندی سے بچنا ہی اسوۂ رسول ہے۔

ہم اپنے موقف کی تفہیم کے لیے حضورؐ کی ایک حدیث کا سہارا لیں گے جو مداہنت اور رواداری کے درمیان حضورؐ کے متوازن اسوۂ کو نمایاں کرتی ہے۔ فرمایا: اِنّی لم اُبعَثْ بالیھودیۃِ ولا بالنصرانیۃِ ولکنی بُعثتُ بالحَنیفیۃ السَمحۃِ[۲۶]

(مجھے نہ تو یہود کے اندازِ دینداری کے ساتھ بھیجا گیا ہے اور نہ نصرانی مذہبیت کے ساتھ،

مجھے اس موحدانہ طرز بندگی کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے جس میں وسعت وآسائش ہے)

اَحَبُّ الدین الی اللہ الحنیفیة السمحة[۲۷] (دین داری کا انداز جو اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے، وہ ہے ٹھیٹھ موحدانہ طرز کی بندگی، جس میں خوب نرمی ومیانہ روی ہو)۔ یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ کچھ حبشی لوگ عید کے روز آئے اور مسجد میں ایک رقص نما کھیل پیش کیا۔ تب نبی ﷺ نے مجھے بھی بلا لیا۔ میں آپ کے کندھے پر اپنا سر رکھ کر ان کا کھیل دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے خود ہی ان کی طرف سے توجہ پھیر لی۔[۲۸]

عروہ کہتے ہیں کہ عائشہ نے کہا اس روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: **لِتَعلمِ الیَھود انّ فی دیننا فُسْحَة انّی اُرسلتُ بحنیفیة سمحةً**[۲۹] علامہ البانی نے ''**خذوایا بنی رفدہ! حتی تعلم الیھود والنصاریٰ ان فی دیننا فُسحة**[۳۰] (شاباش حبش کے جوانو! تاکہ عیسائی ویہود جان لیں کہ ہمارے دین میں بڑی وسعت ہے۔) کے الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں شرک وبت پرستی کو غلط جاننے والے اور عام برائیوں سے دامن کش رہنے والے صاحب عزم انسانوں کو حنیف کے نام سے جانا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کیلئے قرآن نے ''**حنیفا مسلما**'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ حنف یحنف کا مطلب مڑا ہونا بھی ہے اور سیدھا ہونا بھی۔ میلان ختم کر لینا بھی ہے اور میلان پیدا کر لینا بھی۔ ایک طرف سے ٹوٹنا دوسرے سے جڑنا۔ گویا حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی طرف سے بالکل ہٹ کر کسی اور طرف کا ہو لے۔ چنانچہ حنیفیت کا معروف معنی ہے سب معبودوں سے ناطہ توڑ کر ایک ہی معبود کا ہو رہنا۔ سمحہ کے معنی ہیں میانہ روی، معقولیت، اعلیٰ ظرفی، وسعت نظر کے ساتھ آسانی ونرمی، رواداری ورحمدلی۔ گویا اسلام مذہبی جکڑ بندیوں کا نام نہیں۔ جائز خواہشات کو دبا دینا اور جذبات واحساسات کا قتل جائز نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ میں ہمیں حنیفیہ اور سمحہ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ایک طرف ایسے اصول ہیں جن پر کوئی مفاہمت نہیں یعنی باطل سے کوئی سازگاری نہیں، یکسو ہو کر ایک رب کا ہو رہنا ہے۔ دوسری طرف دعوت وتربیت، ابلاغ اور قائل کرنے میں کوئی جبر نہیں۔ دعوتی عمل میں حد درجہ معقولیت، مخاطبین کی سہولت کا خیال، نہ ماننے والوں سے کسی الجھاؤ کا شائبہ تک نہ ہونا، لکم دینکم ولی دین کے شرک بیزار اعلان کے ساتھ ہر ایک کو **بشّروا ولا تنفّروا ویسّروا ولا تعسّروا**[۳۱] کی نوید جانفزا۔

چنانچہ اصولی مسائل میں اگر خاندان میں واحد پشتیبان آپ کے چچا ابوطالب جب قبیلہ قریش کے سرداروں کے دباؤ اور اپنی مجبوریوں کا احساس دلا کر ایک موقع پر آپ کو کچھ مفاہمت کی راہ دکھانا چاہتے ہیں تو آپ کا یہ فرمانا کہ واللہ اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں تو بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آؤں گا۔ اس میں ہمارے لیے یہ رہنمائی موجود ہے کہ دینی

اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ عتبہ بن ربیعہ کی طرف سے کلمہ کی دعوت چھوڑنے کے نتیجے میں حکومت و دولت کی پیش کش کو آپ کی طرف سے ٹھکرانا معمولی بات نہیں۔ کوئی دانشور کہہ سکتا ہے کہ آپ پہلے حکومت لے لیتے اور پھر حکومت کی طاقت سے توحید کی دعوت کی ترویج کرتے لیکن آپ نے اصولِ توحید کی تنفیذ کے لیے مشرکانہ سیادت کا بار احسان اٹھانا گوارا نہ کیا۔

اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں ایک مسلمان کا کام دین کو بلاکم وکاست انسانوں تک پہنچا دینا ہے اب کوئی اللہ کے نازل کردہ دین کو نہیں مانتا تو اس زندگی میں اسے اس کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس کا فیصلہ روزِ محشر اللہ نے کرنا ہے، ہم نے نہیں۔ البتہ یہاں ہم باطل کے پرستاروں پر ان کی غلطی کو واضح بھی کریں گے اور انہیں عذابِ الٰہی سے ڈرائیں گے بھی۔

مسلم مکاتبِ فکر کے درمیان رواداری

اب تک ہم نے دیگر اقوام و مذاہب کے معاملے میں رواداری کے مفہوم کے تعین کی کوشش کی ہے۔ اب خود مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے مختلف مکاتب فکر کے درمیان ہم آہنگی کے فروغ کے لیے جس رواداری کی ضرورت ہے، اسے سیرت رسول کی روشنی میں جاننے کی کوشش کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ آج مسلمانوں میں بہت سے مکاتب فکر پائے جاتے ہیں جن میں آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں پائی جاتی ہیں۔ کسی کو دوسرے کی توحید مشکوک نظر آتی ہے تو کوئی دوسرے کو منکر رسول قرار دیتا ہے۔ یقیناً بعض عقائد اور معاملات میں کہیں کہیں بڑے انحرافات بھی نظر آتے ہیں۔ جو انحراف اصولی ہے، اس پر تنقید نہ کرنا بھی امت کے لیے مفید نہیں۔ امت کو اصل دین پر قائم رکھنے کے لیے اصل دین کا اجاگر کرتے رہنا ضروری ہے۔ لیکن اس تنقید و تحقیق کو ایسے اصولوں کا پابند رکھنا ضروری ہے جو ہمیں اسوہ رسول سے حاصل ہوتے ہیں۔

لوگوں پر دھڑا دھڑ کفر و شرک کے فتوے لگانا جب کہ وہ کلمہ گو اہلِ قبلہ ہوں، نبوی دعوت کا اسلوب نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ ان افراد پر کوئی دعوتی حجت بھی قائم نہ ہوئی ہو۔ اس کے باوجود کہ حضورؐ پر منافقین کا نفاق واضح تھا، آپ نے کبھی کسی منافق کو بھی منافق کہہ کر خطاب نہیں کیا۔ قرآن میں کسی ایک جگہ بھی یا ایھا المنافقون کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے حالانکہ قرآن میں جگہ جگہ منافقین کے رزائل بیان ہوئے ہیں۔ جب بھی کسی مسلمان یا مسلمانوں کے کسی گروہ کی خامی حضورؐ کے علم میں آتی تو آپ برسرِ منبر اس خرابی پر زجر و توبیخ ضرور فرماتے لیکن ان افراد کا نام کبھی نہ لیتے تھے۔

اگر کسی امر پر دلیل ملتی ہو اور امت کے معتبر اہل علم کی گواہی موجود ہو تو اس کی روشنی میں یہ کہنا کہ یہ کام شرک ہے یا یہ رویّہ کفر ہے، یہ گناہ ہے یا فسق ہے، اس کے کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ کسی متعین فرد یا گروہ کا نام متعین کر کے اسے کافر و مشرک، بدعتی یا منافق کہنا بہت سے پہلوؤں سے تحقیق و تفتیش کا

متقاضی ہے۔لوگوں کو خدا کا حق بتانے میں خوشگوار اور موثر انداز اختیار کرنا ضروری ہے۔مخاطب کو بات سمجھنے کے لیے مناسب وقت دینا اور اس کی دینی استعداد کے مطابق تدریج اختیار کرنا ضروری ہے۔

حق بات کے اظہار کی جہاں آدمی استطاعت واہلیت نہ رکھتا ہو یا جہاں باطل کا رد کرنے کی حالات اجازت نہ دیتے ہوں وہاں خاموش رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس روز بعد بنی اسرائیل کی طرف واپس آئے اور انہیں گئو پرستی میں مبتلا پایا تو انہوں نے اپنے بھائی حضرت ہارون سے پوچھا:**مامنعك اذرايتهم ضلوا الا تتبعن** ''تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ تم میرے طریقے پر عمل نہ کرو۔''تو ہارون علیہ السلام نے جواب میں کہا:**انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی** [۳۲] (مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آ کر کہے گا کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد قوم نے جو بت پرستی اور سرکشی کی راہ اختیار کی اور سورہ اعراف کے مطابق حضرت ہارون کو اپنی جان کی ہلاکت اور ااس کے نتیجے میں قوم کے انتشار کا خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ کی واپسی کے انتظار تک جو مصلحت اختیار کی قرآن نے اسے ناپسندیدہ قرار نہیں دیا۔

دین کے اجتہادی وفروعی معاملات میں حضورؐ نے مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو نہ صرف برداشت کرنے کی تربیت دی بلکہ اس عمل کو حصولِ فضیلت کا ذریعہ قرار دیا۔فرمایا: **انا زعيم ببيت فی ربض الجنه لمن ترك المراء وان كان محقا** [۳۳] (میں اس شخص کے لیے جنت کے وسط میں گھر کا ضامن ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے)۔

قوم کے فتنہ وہیجان میں مبتلا ہونے کے خطرہ کے پیش نظر آپ نے اپنے پسندیدہ عمل کو بھی ترک کر دیا۔خانہ کعبہ کی عمارت ادبار زمانہ کے باعث اب مکمل طور پر ان بنیادوں پر موجود نہ تھی جن پر ابراہیم علیہ السلام نے کھڑا کیا تھا۔حضورؐ ایسا کرنا چاہتے تھے۔ایک دن حضرت عائشہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:''میرا دل چاہتا ہے کہ خانہ کعبہ کی عمارت انہیں بنیادوں پر کھڑا کروں جہاں اسے ابراہیم علیہ السلام نے کھڑا کیا تھا لیکن اس وجہ سے رک جاتا ہوں کہ تیری قوم نئی نئی مسلمان ہوئی ہے۔''[۳۴]

اللہ کے وہ رسول جنہوں نے دعوت حق کے بیان میں کبھی کافروں کی سختیوں اور مخالفتوں کی پرواہ نہ کی اور نہ کسی ملامت کا خوف کھایا، وہ اس بات سے کیوں محتاط ہیں کہ خانہ کعبہ کی نئی تعمیر سے قوم بگڑ جائے گی۔اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مسئلہ دین کا اساسی مسئلہ نہ تھا کہ جس کا پایہ تکمیل تک پہنچانا ضروری ہوتا۔اگر ایسا ہوتا تو آپ کسی بھی ملامت کا خوف نہ کھاتے۔لیکن چونکہ یہ مسئلہ فروعی نوعیت کا تھا اس لیے اس میں آپ نے لوگوں کے جذبات کے لحاظ کرنے کو کعبہ کی تعمیر نو پر ترجیح دی۔گویا کہ مسلمانوں کو یہ راہ دکھائی کہ آپس میں وہ فروعی معاملات میں الجھنے سے زیادہ امت کے اتحاد کو اہمیت دیں اور باہمی رواداری کا رویہ اپنائیں۔

اسوۂ رسول میں ہمیں احکام شریعت کے فہم واستنباط میں توسع اور تنوع کی اتنی گنجائش نظر آتی ہے کہ اس میں تعدد مذاہب کا قبول کیا جانا، ہمارے اسلاف کی شاندار علمی روایت کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔اس ذریعے سے انسانی صلاحیتوں کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں اور تعمیری وتحقیقی عمل کے لیے ایک سازگار ماحول بنانے کے بارے میں بے حد متوازن آداب وحدود رہنمائی کا کام دے سکتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے بنی قریظہ کی طرف ایک دستہ کو روانہ کرتے ہوئے نصیحت کی: لایُصَلِّیَنَّ احد العصر الا فی بنی قریظۃ (کوئی بھی شخص بنی قریظہ کی بستی کے سوا نماز عصر نہ پڑھے) صحابہ کرام جب راستے میں تھے کہ محسوس ہوا کہ وہ مغرب سے پہلے کسی طرح بھی بنی قریظہ کی بستی میں نہیں پہنچ سکیں گے۔اس لیے ایک گروہ نے نماز قضاء ہونے کے خدشے کے پیش نظر کہا کہ نماز عصر یہیں ادا کر لینی چاہیے ۔دوسروں نے کہا کہ آپؐ کا حکم بنی قریظہ میں پہنچ کر نماز عصر ادا کرنے کا ہے۔

پہلے گروہ نے اس کی تاویل کی کہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچیں لیکن اب ایسا ممکن نہیں، جب ہم نماز عصر کے دورانیے میں وہاں نہیں پہنچ سکتے تو نماز قضا نہ کریں۔لہٰذا ایک گروہ نے عصر کی نماز راستے میں پڑھی جبکہ دوسرے گروہ نے منزل پر پہنچنا ضروری سمجھا لیکن ان کی نماز قضاء ہوگئی۔ مہم سے فراغت کے بعد بارگاہ نبویؐ میں سب کی حاضری ہوئی اور آپ سے اس معاملے کا ذکر کیا گیا تو آپ نے کسی کو بھی سرزنش نہ فرمائی: **فذُکر ذالك للنبی ﷺ فلم یعنف واحدامنهم** (۳۵)

ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت ابوسعیدؓ خدری اور عطاءؒ بن یسار ہیں، کے مطابق دو صحابہ سفر پر تھے کہ پانی کی عدم دستیابی کے باعث تیمّم کر کے نماز ادا کر لی اور پھر مزید سفر پر روانہ ہوئے۔ادا کی گئی نماز کا وقت ابھی باقی تھا کہ پانی میسر آ گیا۔ایک صحابی نے کہا کہ اب ہمارا عذر ختم ہو گیا ہے اور نماز کا وقت بھی باقی ہے لہٰذا ہمیں نماز دوبارہ پڑھنی چاہیے۔دوسرے نے کہا کہ میں تو نہیں دھراؤں گا کیونکہ جس وقت ہم نے تیمّم سے نماز پڑھی تھی اس وقت ہمارا عذر موجود تھا۔جب بارگاہ رسالت میں پہنچے اور اس معاملے میں رہنمائی کے طلب گار ہوئے تو جس نے نماز نہیں دہرائی تھی آپ نے اس سے کہا کہ تو سنت کو پا گیا اور تیرے لیے تیری نماز کافی ہوگئی۔**فقال للذی لم یعد اصبت السنة واجزاء** جبکہ نماز دہرانے والے سے فرمایا: کہ تمہارے لیے دہرا اجر ہے۔**لك الاجر مرتین** (۳۶) گویا کہ دونوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ان دونوں احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ میں بھی مختلف علمی ذوق ومزاج اور علمی سطح کے افراد موجود تھے اور حضورؐ نے قرآن وحدیث کے فہم وتعبیر میں ان کے اختلاف کو جائز قرار دیا اس لیے کہ دونوں آراء رکھنے والوں کو قول رسول کی حجیت اور اہمیت سے انکار نہیں تھا لیکن پیش آمدہ نئی صورت حال میں آپ کے الفاظ کی تفہیم وتعبیر میں اختلاف ہوا، اس لیے آپ نے کسی پر گرفت نہیں کی۔

اسوۂ رسول کے اسی پہلو کے پیش نظر ہمیں اسلاف میں وہ رواداراانہ طرز عمل دکھائی دیتا ہے جس کا ذکر شاہ ولی اللہ کی کتاب الانصاف فی بیان سبب الاختلاف میں ملتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ خلیفہ ہارون

الرشید نے جب امام مالک سے کہا کہ آپ کے مجموعہ احادیث موطا میں آپ کی جو فقہی آراء ہیں، کیوں نہ تمام امت کو سرکاری طور پر اس کا پابند کر دیا جائے تو امام مالک نے انہیں اس سے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ امیر المومنین ایسا نہ کریں مختلف دیار میں محدثین وفقہاء پہنچ چکے ہیں جن کے علم وتقویٰ پر وہاں کے لوگوں کا اعتماد قائم ہے۔آپ زبردستی کر کے ان پر زیادتی کریں گے۔اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھنے کے قائل تھے جب انہوں نے کوفہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں نماز فجر پڑھائی اور دعائے قنوت نہ پڑھی تو لوگوں نے پوچھا کہ آج آپ نے دعائے قنوت نہیں پڑھی تو آپ نے فرمایا کہ آج میں ان کے دیار میں ہوں جو ایسا نہیں کرتے ہیں میں نے اس کے خلاف کرنا مناسب نہ جانا۔(۳۷)

آج کے گلوبل ویلیج میں جس تہذیبی اور ثقافتی کشمکش سے ہمیں واسطہ ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کیلئے جہاں ایک طرف دین کے ٹھیٹھ اور واضح تصور کی ضرورت ہے وہاں داعیان دین کے لیے زمانہ شناس ہونا بھی ضروری ہے۔اپنے زمانے کو سمجھے بغیر اگر ہم نے کوئی اقدام کیا تو ہماری اس کمزوری کا فائدہ کفر ہی کو ہوگا۔اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جن موضوعات پر آج بین الاقوامی سطح پر بحث ہو رہی ہے ان کے بارے میں ہم کسی ردعمل کی نفسیات کا شکار ہوئے بغیر اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ٹھیک ٹھیک اپنے لیے رہنما خطوط متعین کریں تا کہ ایک طرف ہم اپنی اقدار وروایات کا تحفظ کر سکیں تو دوسری طرف دیگر اقوام کے سامنے اسلام کا خوبصورت امیج پیش کر سکیں۔

حوالہ جات

۱۔ الغاشیہ (۸۸)۲۱ ۲۔ الغاشیہ(۸۸)۲۲
۳۔ الکافرون(۱۰۹)۶ ۴۔ البقرہ(۲)۲۵۶
۵۔ النحل(۱۶)۱۲۵ ۶۔ الکہف(۱۸)۲۹
۷۔ الانعام(۶)۱۰۸
۸۔ محمد بن اسماعیل بخاری: الجامع الصحیح، کتاب اللباس، رقم الحدیث ۵۷۹۵، دارلسلام الریاض، ۱۹۹۹ء
۹۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، رقم الحدیث ۱۳۱۲
11. Dr.Muhammad Hamidullah, The First Written Constitution in the World, Sheikh Muhammad Ashraf Lahore, 1975:P:24
۱۱۔ الحج (۲۲)۴۰
۱۲۔ سلیمان بن اشعث :سنن ابو داؤد، کتاب الخراج والفئ والامارۃ ، باب اخذ الجزیۃ حدیث رقم: ۲۶۴۴ دارالسلام الریاض۔س ن
۱۳۔ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم: کتاب الخراج، مطبعۃ السلفیۃ قاہرہ، ۱۳۹۶ھ، ص ۱۵۴

۱۴۔ ایضاً،ص۱۵۸
۱۵۔ شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، س ن، ۲/۵۱
16. William Muir: Life of Mahomet, Smith Elder & Company London 1958 P-158
۱۷۔ ششماہی وشال بھارت، کلکتہ، نومبر ۱۹۳۳ء، ص۵۱۴
18. Arm Strong: Muhammad a Western attempt to understandaing Islam, Blackie & Son London, p:266
19. Bertrend Russel: Why I am not christion, Contstable & Company Ltd. London, p:25
۲۰۔ یونس (۱۵)۱۷ ۲۱۔ القلم (۶۸)۹
۲۲۔ ابن جریر طبری: جامع البیان، دارالاعلام، عمان، ۱۴۲۳، ۱۹/۲۸
۲۳۔ ابی عبداللہ قرطبی: الجامع الاحکام القرآن، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۶۶ء، ۹/۲۳۰
۲۴۔ ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، امجد اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۲ء، ۴/۴۰۳
۲۵۔ البقرہ (۲)۸۳
۲۶۔ احمد بن حنبل: المسند، کتاب الایمان، رقم ۲۱۶۲۰ دارالفکر بیروت، س۔ن
۲۷۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، رقم الحدیث ۳۷، طبرانی، رقم ۷۵۶۲
۲۸۔ مسند احمد، رقم ۱۲۰۸۲، صحیح مسلم، رقم ۱۴۸۳
۲۹۔ مسند احمد، رقم ۲۳۷۱۰، ۲۴۷۷۱
۳۰۔ ناصر الدین البانی: السلسلۃ الصحیحہ، رقم ۱۸۲۹، المکتب الاسلامی دمشق ۱۹۸۵ء
۳۱۔ مسلم بن حجاج: الجامع الصحیح، کتاب الجہاد، رقم ۳۲۶۲، دارالسلام الریاض، ۲۰۰۰ء
۳۲۔ طٰہٰ (۲۰)۹۲۔۹۴
۳۳۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، رقم ۴۸۰۰، دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء
۳۴۔ صحیح بخاری، کتاب فضل مکہ وبنیانہا، رقم ۱۴۸۳
۳۵۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، رقم ۴۱۱۹
۳۶۔ سنن ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، رقم ۳۳۸
۳۷۔ شاہ ولی اللہ، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، ہیۃ الاوقاف لاہور، ۱۹۷۱ء، ص۴۱

❑❑❑